Article

"Sandal Ki Aag: A Study of Spiritual and Aesthetic Dimensions in Modern Urdu Poetry"

"صندل کی آگ": جدید اردو شاعری میں روحانی اور جمالیاتی جہات کا مطالعہ

Dr. Rubina Yasmeen *1

[1] Assistant Professor, Department of Urdu, Sarhad University of Science and Information Technology, Peshawar

Maryam Akram Khan*2

[2]Lecturer, Department of Urdu, University Community College, Government College University, Faisalabad

ڈاکٹر روبینہ یاسمین[1]

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، سرحد یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی، پشاور

مریم اکرم خاں[2]

[2]استاد شعبہ اردو، یونیورسٹی کمیونٹی کالج'جی سی یونیورسٹی'فیصل آباد

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Copyright: © 2025 by the authors.

Abstract:

"Sandal Ki Aag" by Professor Saba Javed is a remarkable collection of Urdu poetry encompassing both ghazals and free verse, blending classical traditions with modern expressions. This critical study explores the thematic, aesthetic, and spiritual dimensions of the collection, highlighting the poet's skillful use of brevity, precision, and evocative imagery. Professor Saba Javed's poetry reflects a deep engagement with faith, human emotions, and existential reflections, particularly evident in her Hamd, Naat, and devotional compositions. The study also examines her mastery over language, her ability to convey complex thoughts with minimal words, and the seamless integration of traditional motifs with contemporary sensibilities. Through this analysis, the paper demonstrates how "Sandal Ki Aag" achieves a balance between intellectual depth and emotional resonance, offering readers both aesthetic pleasure and spiritual insight.

Keywords:

Modern Urdu Poetry, Sandal Ki Aag, Spiritual Themes, Aesthetic Sensibility, Naat, Hamad

"صندل کی آگ "پروفیسر صباجاوید کا شعری مجموعہ ہے جس میں غزل اور نظم دونوں اصناف پوری فکری وسعت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس مجموعے میں معریٰ نظموں کے ساتھ ساتھ آزاد نظموں کی موجودگی بھی اس کی ہیئتاتی تنوع کو نمایاں کرتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اپنی فکری جہت، اسلوبی انفرادیت اور موضوعاتی گہرائی کے باعث اردو شاعری میں ایک منفرد شناخت رکھتی ہے۔

اس مجموعہ کلام کا پہلا انتساب ہی اس کی انفرادیت پر مہر ثبت کر دیتا ہے۔ ننانوے اسمائے حسنیٰ کے حامل ذاتِ باری تعالیٰ کے نام منسوب کر کے پروفیسر صباجاوید نے اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے کہ ان کی شاعری کا سرچشمہ اور فکری محور اللہ رب العزت کی ذات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعے میں حمدِ باری تعالیٰ محض رسمی اظہار نہیں بلکہ ایک گہرے روحانی شعور کے ساتھ سامنے آتی ہے، جو شاعرہ کے فکری تسلسل اور باطنی وابستگی کو نمایاں کرتی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب کسی شعر کے پس منظر میں موجود تجربہ یا واقعہ قاری پر منکشف ہو جائے تو اس کے لطف میں دوچند اضافہ ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی کیفیت پروفیسر صباجاوید کے مجموعہ کلام "صندل کی آگ "میں محسوس ہوتی ہے، جو جذبے اور احساس کی مدھم آنچ پر پختہ ہوئی شاعری کا نمونہ ہے۔ جس فنی نزاکت، اختصار اور ہنر مندی کے ساتھ انہوں نے اپنی نظموں میں وسیع اور گہرے موضوعات کو سمیٹا ہے، وہ بجا طور پر تحسین کی مستحق ہے اور قاری کو ایک منفرد جمالیاتی مسرت سے ہم کنار کرتی ہے۔

"پکار "حمدیہ موضوع کی حامل نظم ہے:

میری زخمی روح پکارتی ہے

تو کہاں سن لے میرے خدا

تیرا آسماں ہے بے کراں

تیری سرزمین ہے سارا جہاں

تیرے مرغزار ہیں ہر طرف

تیرے سبزہ زار ہیں ہر طرف (۱)

اس کے بعد دوسرا انتساب ابوالبشر حضرت آدمؑ سے مکالمے کی صورت میں سامنے آتا ہے، جو انسان کی ازلی کہانی، اس کی خطاؤں، تجربات اور وجودی کرب کی علامتی تعبیر بن جاتا ہے۔ یوں یہ مجموعہ آغاز ہی میں قاری کو کائناتی، روحانی اور انسانی سطحوں پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

میرے آدم!

جواب دو!

میرے سوال کا

تم مجھے کیوں زمیں پہ

آسمان سے لے آئے

مجھے میرا آسماں

میری جنت

میرا خدا دے دو

اور مجھے کچھ نہ دو

خدا کے لیے (۲)

اس انتساب میں محض عقیدت ہی نہیں بلکہ ایک دبے ہوئے شکوے اور داخلی احتجاج کی ہلکی سی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ انسانی وجود کی سب سے بڑی سچائی یہی ہے کہ آدمی نہ اپنی خواہش سے اس دنیا میں قدم رکھتا ہے اور نہ ہی اپنی مرضی سے اس سے رخصت ہوتا ہے۔ حیات و ممات کے فیصلے انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ وہ ازل سے طے شدہ نظام کا حصہ ہے، جہاں اسے آنے یا جانے کے بارے میں کوئی انتخاب میسر نہیں ہوتا۔ یہ جہانِ رنگ و بو اس پر مسلط ہوتا ہے، اختیار نہیں کیا جاتا۔

تاہم اس جبرِ کلی کے باوجود انسان کو ایک محدود مگر بامعنی آزادی ضرور عطا کی گئی ہے، اور وہ یہ کہ وہ زندگی کے فکری و اعتقادی راستے کا انتخاب خود کرتا ہے۔ وہ چاہے تو انکار کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو وحدانیتِ الٰہی کو تسلیم کر کے ایمان کی روشنی میں زندگی بسر کرے۔ پروفیسر صبا جاوید نے اپنے کلام میں اسی وجودی جبر اور معنوی اختیار کی طرف نہایت لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے۔

اگر موضوع اور فکر کے تناظر میں ,,صندل کی آگ" کا جائزہ لیا جائے تو اس کی نمایاں ترین خصوصیت اس کا حمدیہ نظامِ فکر ہے۔ اس مجموعے میں حمدِ باری تعالیٰ محض ایک روایت کے طور پر نہیں بلکہ ایک فکری اساس کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اس کے ساتھ نعتیہ شاعری بھی اس کتاب کا اہم حصہ ہے، کیونکہ حضور اکرم ﷺ کی ذات وہ ہمہ گیر موضوع ہے جس سے کوئی بھی صاحبِ شعور شاعر بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ پروفیسر صبا جاوید نے محامد و محاسنِ رسولِ اکرم ﷺ کو نہ صرف منتشر اشعار میں سمیٹا ہے بلکہ دو مستقل نعتیہ نظموں کے ذریعے بھی اس عقیدت کو باضابطہ اظہار عطا کیا ہے۔

پروفیسر صبا جاوید کی نعتیہ شاعری میں ایک جانب تو قلبی کیفیات کی شدت اور جذباتی وابستگی پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہے، اور دوسری جانب نعت کے روایتی موضوعات کو نئے فکری زاویوں سے برتنے کا شعوری رجحان بھی نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ان کے ہاں اظہارِ عقیدت محض تقلیدی یا مروجہ سانچوں کا اسیر نہیں بلکہ اس میں فکری تازگی اور اسلوبی انفرادیت کی واضح جھلک ملتی ہے۔ نعتیہ مضامین کی پیش کش میں وہ ایسے نئے معنوی قرینے تراشتی ہیں جو جذبے کی سچائی کو برقرار رکھتے ہوئے اظہار کو ایک منفرد شناخت عطا کرتے ہیں۔ یہی توازن — جذبات کی فراوانی اور فکری ندرت کا امتزاج — ان کی نعت کو محض عقیدت کا بیان نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے ایک بامعنی اور باوقار تخلیقی تجربہ بنا دیتا ہے۔

وہ غمزدہ کہ جن و دنیا نہ پوچھتی تھی
آپؐ ان کے بن گئے ہیں غمخوار یا محمدؐ
تنہائیاں حرا کی اور ثور کی رفاقت
ہیں خوش نصیب کتنے یہ غار یا محمدؐ (۳)

پروفیسر صبا جاوید کا اسلوبِ اظہار سادگی، روانی اور عام فہمی کی نمایاں مثال ہے۔ وہ ثقیل اور پیچیدہ لفظیات سے اجتناب برتتے ہوئے روزمرہ زبان کے ذریعے اپنے احساسات قاری تک منتقل کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک نعتیہ شاعری میں فنی کرتب، دعویٰ مہارت یا

اظہار کی تیزی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی، بلکہ اس صنف میں اصل وقعت عجز، نیاز مندی اور قلبی سپردگی کو حاصل ہے۔ نعت کہنے کے عمل میں وہ محض الفاظ کی تراش خراش پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ صداقت کی تلاش کو اپنا بنیادی مقصد بنائے رکھتی ہیں۔ ان کا کامل یقین اس صداقت پر ہے جو غارِ حرا سے جلوہ گر ہوئی اور جس کا سرچشمہ نبیِ آخر الزماں ﷺ کی ذاتِ اقدس ہے؛ وہ اسی صداقت کو اپنی فکر اور عقیدت کی بنیاد تسلیم کرتی ہیں۔

ان کی نعتیہ شاعری دراصل ایمان کے باطنی استحکام کا اظہار ہے جس سے ان کے عقیدے کی پختگی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہو جاتی ہے۔ ان نعتوں میں معنوی حسن بھی جلوہ گر ہے اور بعض مقامات پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لفظ خود بھی عبادت میں مصروف ہوں، حضور نبی کریم ﷺ سے شفاعت کے طلب گار ہوں اور دہر کے تاریک گوشوں کو منور کرنے کے لیے نورِ رسالت کے متلاشی ہوں۔ پروفیسر صبا جاوید نے نعتیہ روایت کے مسلمہ موضوعات کے ساتھ ساتھ جدید نعت کے تقاضوں کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی نعت گوئی میں تنوع، وسعت اور تازگی پیدا ہو گئی ہے۔

صورتِ رسول ﷺ کے بیان کے ساتھ ساتھ وہ سیرتِ مصطفوی ﷺ خصوصاً اس کے فیوض و برکات کو بھی نہایت ذوق و شوق اور فکری وابستگی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ ہیں کہ سیرتِ رسول ﷺ کا آفتاب کسی زوال یا گہن سے آشنا نہیں۔ یہی وہ گلستانِ توحید ہے جو خزاں سے ماورا ہے، وہ ایسا ماہتابِ صد انور ہے جس کی روشنی ہر عہد میں دل و دماغ ہی نہیں بلکہ افکار و کردار کو بھی منور کرتی چلی آئی ہے۔ سیرتِ طیبہ کے اسی فیضانِ عام نے سنگ دلوں کو نرم کیا، بت پرستی میں مبتلا ذہنوں کو توحید سے آشنا کیا اور کفر و شرک کی تاریکیوں میں بھٹکنے والوں کو نورِ ایمان کی جستجو عطا کی۔

اسی فیضانِ نبوی ﷺ کے زیرِ اثر عورت کو پامال کرنے والی ذہنیت عزت و توقیر میں ڈھل گئی، خونریزی کے عادی معاشرے امن و آشتی کے پیامبر بن گئے، بیٹیوں کو زندہ دفن کرنے والے ان کی حرمت و عصمت کے محافظ ٹھہرے اور والدین کے بڑھاپے کو بوجھ سمجھنے والے ان کے قدموں میں جنت تلاش کرنے لگے۔ ظلم، وحشت اور بربریت کی جگہ اخوت، رحمت اور صلح و سلامتی نے لے لی۔ وہ قومیں جو معمولی باتوں پر صدیوں کی دشمنی پالے بیٹھی تھیں، حضور اکرم ﷺ کی بابرکت قیادت میں باہم شیر و شکر ہو گئیں، جیسا کہ شاعر نے بجا طور پر کہا ہے:

صدیوں کی دشمنی کو ہوئی دوستی سے مات
بگڑے ہوئے مزاج قرینے میں ڈھل گئے (۴)

کسی ادبی تخلیق کی اصل قوت اس کی معنوی جامعیت اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی میں مضمر ہوتی ہے۔ یہی وہ وصف ہے جو کسی تحریر کو وقتی پذیرائی سے نکال کر دوام اور مقبولیت کے درجے تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر اختصار کے دامن میں فکری ندرت اور جمالیاتی لطافت بھی سمٹ آئی ہو تو یہ خوبی اس کے حسن کو دوبالا کر دیتی ہے۔ شاعری کا مزاج اس امر کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ اس پر معلومات کا بوجھ لاد کر اسے ثقالت کا شکار بنا دیا جائے، کیوں کہ حد سے بڑھی ہوئی تفصیل نہ صرف بصری اور ذہنی تھکن کا باعث بنتی ہے بلکہ اپنے مقصدی اثر سے بھی محروم ہو جاتی ہے۔

اردو شاعری کی روایت میں ایسے شعرا کی کمی نہیں جن کی نظم و غزل فکری طور پر توانا، معنوی اعتبار سے زرخیز اور فنی سطح پر معتبر ہے۔ ان کے کلام میں آمد کی وہ قدرتی روانی پائی جاتی ہے جو بنا کسی تصنع کے قاری کے دل میں اتر جاتی ہے، جب کہ بعض دیگر شعرا محض وقتی مشقِ سخن یا عروضی مہارت پر انحصار کرتے ہیں۔ ایسے کلام میں نہ تو فکری گہرائی پیدا ہو پاتی ہے اور نہ ہی وہ دیرپا تاثر قائم رکھ پاتا ہے، نتیجتاً وہ مقبولیت کے زینے سے اتر کر قاری کی یادداشت سے بھی محو ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس وہ شاعری جس میں خودستائی کی آمیزش کم، اظہار میں سادگی اور اسلوب میں اختصار نمایاں ہو، زیادہ دیر تک زندہ رہتی ہے اور وقت کا کڑا انتقاد بھی اس کی فنی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ لفظوں کے انتخاب میں حد درجہ محتاط اور کفایت شعار ہو، مگر معنی کے باب میں اس کی سخاوت بے مثال ہو — کہ یہی توازن شاعری کو وقار اور تاثیر عطا کرتا ہے۔

پروفیسر صبا جاوید اس تناظر میں ایک باخبر اور کامیاب تخلیق کار کے طور پر سامنے آتی ہیں، جو فکری وسعت کے باوجود اظہار میں غیر ضروری پھیلاؤ سے گریز کرتی ہیں۔ وہ گہرے، پیچیدہ اور بعض اوقات نہایت بوجھل موضوعات کو بھی نظم کے قالب میں اس طرح سمیٹ دیتی ہیں کہ لفظوں کی قلت کے باوجود معنی کی فراوانی محسوس ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ایجاز محض اختصار نہیں بلکہ ایک تخلیقی ہنر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال ان کی نظم "دُھند" ہے، جسے پڑھتے ہوئے قاری پر ان کے اسلوب کی شائستگی، فکری گہرائی اور کم لفظوں میں بھرپور تاثر قائم کرنے کی قدرت بخوبی آشکار ہو جاتی ہے۔ بقول شاعرہ:

کبھی سوچوں کی دھند سے نکلو

اور باہر کو

جھلک کر دیکھو

سبز بیلوں اور بند دریچوں سے

کتنی ہی روشنی لپٹی

ان لمحوں کے

ہاں انتظار میں ہے

کب کھلیں یہ دریچے اور

وہ تیری زندگی میں در آئے(۵)

پروفیسر صبا جاوید کی نظموں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا غیر معمولی ایجاز اور بامعنی اختصار ہے۔ وہ جذبات اور واقعات کو بلا ضرورت پھیلانے کے بجائے اشارے اور کنایے میں سمیٹ دیتی ہیں، اور غیر ضروری جزئیات کو دانستہ طور پر نظر انداز کر دیتی ہیں۔ ان کے ہاں لفظوں کا انتخاب اس قدر محتاط اور بامقصد ہوتا ہے کہ کم سے کم الفاظ میں وسیع تر معنوی جہات کھل جاتی ہیں۔ دراصل یہی ان کے باطنی احساسات اور قلبی کیفیات کا سچا اظہار بھی ہے۔ شعری مجموعہ "صندل کی آگ" اس امر کا واضح ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ اظہار کی اس اعلیٰ صفت—ایجاز—پر بھرپور دسترس رکھتی ہیں۔

فنی اعتبار سے بھی پروفیسر صبا جاوید کی شاعری ان کے شعری شعور اور فنِ شعر پر گہری گرفت کی غماز ہے۔ انہوں نے جدید آزاد نظم کے رائج اسالیب سے نہایت سلیقے اور فطری انداز میں نباہ کیا ہے، اور بعض مقامات پر نظمِ معریٰ میں روایت سے وابستگی کا شعوری مظاہرہ بھی کیا ہے۔ ان کی نظموں میں سادگی، روانی اور سلاست ایک فطری بہاؤ کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے، جب کہ برجستگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں رہتی ہے۔ وہ شعر تو کہتی ہیں، مگر ان کا کلام نہ تو ثقیل ہے اور نہ ہی ابہام کا شکار؛ بلکہ صاف، شستہ اور سہل ممتنع کی کیفیت لیے ہوئے ہے۔

مزید بر آں، "صندل کی آگ" کو اگر یادوں اور تجربات کا گلدستہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس گلدستے میں شاعرہ نے اپنے احساسات اور جذبات کو صندل کے پھولوں کی مانند ترتیب دیا ہے — کچھ خوشبو سے لبریز، کچھ محض جمالیاتی آرائش کے لیے۔ یوں اس مجموعے میں نہ تمام نظمیں یکساں خوشبو رکھتی ہیں اور نہ ہی سبھی محض رنگ و آہنگ کا مظہر ہیں، بلکہ ایک فکری و جمالیاتی توازن قائم رکھا گیا ہے جو اس کے حسن کو تازگی بخشتا ہے۔ ان نازک، خوش رنگ اور مہک دار شعری پیکروں میں تخلیقی نورانیت ایک ایسا سحر پیدا کرتی ہے کہ قاری دیر تک اس کی گرفت میں رہتا ہے۔

فنی اور فکری دونوں حوالوں سے پروفیسر صبا جاوید کا مجموعۂ کلام ایک قابلِ تعریف نمونہ ہے۔ اس میں شاعرانہ بصیرت، فکری بیداری اور تخلیقی شعور پوری طرح جلوہ گر ہے۔ شاعرہ نے کسی بھی مقام پر جذبے اور احساس کے رشتے کو کمزور نہیں پڑنے دیا، بلکہ یہی وابستگی اس مجموعے کی سب سے بڑی خوبی بن کر سامنے آتی ہے۔ جب فضا پر خاموشی کا غلبہ ہو اور پورا گلشن ویرانی کا منظر پیش کرنے لگے، تو اسی لمحے اس گلشن کا بلبل نغمہ سرا ہو جاتا ہے اور خاموشی کو آواز میں ڈھال دیتا ہے۔ یہی کیفیت پروفیسر صبا جاوید کے اس مجموعے میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہاں شاعرانہ لطافت بھی موجود ہے، تاہم ان کے دیگر شعری مجموعات کے مقابلے میں اس کلام میں علمی حوالوں سے زیادہ جذبے اور احساس کی شدت نمایاں نظر آتی ہے۔

پروفیسر صبا جاوید ایک ہمہ جہت شخصیت کی حامل ہیں۔ انہوں نے تقریباً تمام اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر میدان میں اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہے۔ وہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سنجیدہ ادیبہ اور باخبر نقاد بھی ہیں۔ کارگاہِ حیات میں ہر انسان کی فطری ساخت اور ذہنی تشکیل دوسرے سے مختلف ہوتی ہے؛ یہی اختلاف جہاں معاشرتی حسن کا سبب بنتا ہے وہیں بعض اوقات الجھن اور کشمکش کو بھی جنم دیتا ہے۔ ہر فرد اپنی ذات میں ایک مکمل داستان ہوتا ہے اور ساتھ ہی دوسروں کی کہانیوں کا حصہ بھی، کیونکہ انسانی زندگی باہمی تعلقات اور مشترکہ تجربات سے تشکیل پاتی ہے۔

اگرچہ ہر شخص کی زندگی کسی نہ کسی طور دلچسپ ہوتی ہے اور اس میں دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت کا سامان موجود ہوتا ہے، مگر ہر کوئی اپنی زندگی کی کہانی کو شعری قالب میں ڈھالنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اظہار کا ملکہ ہر ایک کو عطا نہیں ہوتا اور بامعنی، سلیس اور مؤثر تحریر تو ایک خداداد وصف ہے جو آج کے عہد میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ بعض لوگ تحریر میں خود نمائی اور ذاتی مدح کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جب کہ کچھ افراد خبطِ عظمت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسی شاعری جو تصنع اور بناوٹ کا لبادہ اوڑھ کر سامنے آئے، دیرپا اثر قائم نہیں کر سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ شعر کہنا نہایت نازک اور صبر آزما عمل ہے۔ یہ ایسا تخلیقی سفر ہے جس میں ہر قدم پر اسلوبی باریکیوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور ذرا سی لغزش پوری تخلیق کو متاثر کر سکتی ہے۔ شاعری میں کچھ چھپانے یا پردہ ڈالنے کی گنجائش نہیں ہوتی، یہاں سب کچھ پیش کرنا پڑتا ہے، مگر اس طرح کہ اظہار میں بھدا پن یا سطحیت در نہ آئے۔ یوں شاعر خود اپنے لیے ایک دشوار گزار راستہ متعین کرتا ہے جس پر چلنا آسان نہیں ہوتا۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ پروفیسر صبا جاوید جب عوامی اور اجتماعی موضوعات کو موضوعِ سخن بناتی ہیں تو وہاں بھی شعریت اور فنی توازن کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔ اسی سبب ان کے شعری اسلوب میں کہیں لغزش یا کمزوری دکھائی نہیں دیتی۔ بات کہنے کا سلیقہ، اظہار کا قرینہ اور زبان کی شائستگی انسان کی فکری سطح اور تہذیبی قد کا تعین کرتی ہے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایتھنز کے ساحل پر سقراط گہری فکر میں سمندر کی لہروں کو تک رہا تھا کہ ایک نوجوان شاہانہ لباس اور ظاہری ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ اس کے سامنے آ کر اپنی نمود و نمائش کرنے لگا۔ جب وہ باز نہ آیا تو سقراط نے اس سے کہا: "ذرا گفتگو کیجیے تاکہ آپ کی حقیقت آشکار ہو سکے۔"

گویا کلام انسان کی اصل پہچان بن جاتا ہے۔ شاعری ہو یا ادب کی کوئی اور صنف، اس کی بنیادی قدر و قیمت اس کے اسلوبِ نگارش ہی سے متعین ہوتی ہے، اور اسی کسوٹی پر پروفیسر صبا جاوید کی شاعری پورے وقار کے ساتھ پوری اترتی ہے۔

اگر اسلوبِ نگارش عام فہم، دلچسپ اور زبان و بیان کے حوالے سے سہلِ ممتنع کا حامل ہو تو اس میں بلا کی کشش ہوتی ہی اور قاری کو اس کی جاذبیت اپنے اندر منہمک ہو جانے کی دعوت دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحبِ طرز ادبا کی تحریروں کو دیکھ کر ہی لوگ یہ بتا دیا کرتے ہیں کہ کس ادیب کی تحریر ہے۔ "صندل کی آگ" میں جو شاعرانہ اسلوب اپنایا گیا ہے وہ پروفیسر صبا جاوید کی تخلیقی پہچان بن گیا ہے۔ سیاسی موضوعات پر طبع آزمائی بذاتِ خود ایک غیر شاعرانہ عمل ہے لیکن پروفیسر صبا جاوید نے دیکھیے "زمینِ کشمیر" میں کس ادا سے شاعرانہ تخلیقیت کا شاہکار بنایا ہے۔ "احتجاج" میں کئی الفاظ ایسے ہیں جو غیر فصیح مرکب مہمل تابع موضوع ہیں لیکن اس کا ورتارا اور سبھاؤ ہی اس کو شعریت میں گوندھتا ہے یا نہیں شامل ہونے دیتا یہ اشعار پڑھنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے اور پروفیسر صبا جاوید کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے میں آسانی ہوتی ہے کہ وہ صاحبِ اسلوب شاعرہ ہیں۔ نظم "ہنر" دیکھئے:

میری زندگی کے سارے سانس

اس کے قبضے میں کیوں ہیں

وہ جو روٹھے

تو روٹھ جائے سانس

وہ جو پلٹے تو زندگی پلٹے

یہ ہنر سیکھنا ہے مجھے

جی سکوں اس بنا

بھلا کیسے ؟(۶)

انتقادی حوالے سے جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر صبا جاوید کے اسلوبِ نگارش پر سیر حاصل بحث کی جاسکتی ہے۔ پروفیسر صبا جاوید کے طرزِ نگارش کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ زبان و بیان میں کبھی عامیانہ پن نہیں آنے دیتیں اور زبان کی برتری قائم کرنے کے لیے وہ عامیانہ الفاظ و تراکیب کا استعمال نہیں کرتیں۔ شعری تخلیق کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا بیانیہ محاکاتی ہوتا ہے اور تجسیم نگاری و تمثال کاریت سے شاعری میں حیاتیاتی خواص پیدا کیے جاتے ہیں۔ اس کی افادیت بھی ہے کہ نہ سمجھ آنے والے چیزیں کسی منظر نگاری میں یہ سراپا بیان کرنے میں یا دیگر حشو و زوائد کے بیان کرنے کے امر میں اتنی شوخ اور واضح ہو جاتی ہیں کہ ان کے مخفی پہلو بھی روشن ہو جاتے ہیں اور ان کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔ پروفیسر صبا جاوید کا اسلوبِ بیان اسی طرح کا ہے۔ اسی تناظر میں ان کی نظم ''شجر کا حوصلہ'' میں سے یہ اشعار دیکھئے:

کبھی تم نے شجر کا حوصلہ دیکھا ہے

ایک اک کر کے سارے ہی پتے

اس سے توڑ کر رشتے

جوڑ لیتے ہیں زمین سے تعلق

لیکن وہ پھر بھی کھڑا رہتا ہے

سربلند اور سیدھا

کتنی ہی بارشیں برسیں

کیسی ہی دھوپ کیوں نہ پڑے

کتنے طوفان اس کو جھنجھوڑیں

اپنی ننگی اور گونگی شاخوں پر

موسموں کی یہ بے رخی ساری

سہتا رہتا ہے کھڑا رہتا ہے(۷)

پروفیسر صبا جاوید کی آزاد نظموں میں ایک اور فنی اختصاص ان نظموں میں کی جانے والی منظر نگاری ہے جو انتہائی مکمل، جزئیات کی حامل اور تخلیقی نوعیت کی ہوتی ہے۔ وہ منظر نگاری کرتی ہیں، مکالمے تخلیق کرتی ہیں، کردار نگاری کرتی ہیں، تشبیہ و استعارہ سے کام لیتی ہیں، تلمیحات کا پر زور استعمال کرتی ہیں جس سے پروفیسر صبا جاوید کی نظموں میں تخلیقی زرخیزی و شادابی کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کا ادبی تجربہ بھی ہے اور ان کی اپنی عہد کی بپتا بھی ہے جسے وہ اپنے خاص انداز سے بیان کرتی ہیں۔ اشاروں، کنایوں سے کام لینے کے بجائے واضح اور واشگاف انداز میں لکھنے کے عادی ہیں۔ نظموں میں طوالت کہیں بھی نہیں ہے۔ بڑے مختصر مصاریع میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرتی ہیں۔ منظر نگاری میں کمالِ فن انھیں حاصل ہے۔ جب کوئی منظر بیان کر رہی ہوں تو اس میں جزئیات کو خاص انداز میں اس طرح سمیٹ لیتی ہیں کہ کہیں بھی کوئی کڑی چھوٹی ہوئی نہیں لگتی اور پورا منظر آنکھوں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔ وہ ایک مجرد منظر میں اپنے الفاظ کے ذریعے روح پھونک کر اسے زندہ و جاید بنانے کے فن سے آشنا ہیں۔ ایسا تب ہی ممکن ہے کہ لکھنے والا محاکاتی اندازِ بیان اپنائے۔

مجھے حیرت ہے

محبتوں کے پھول

جس قدر بانٹتی ہوں لوگوں میں

میرے اور تیرے درمیان

دیوارِ مغائرت

اس قدر گرتی چلی جاتی ہے(۸)

محبت بانٹنے سے محبت تقسیم نہیں ہوتی بلکہ بڑھتی جاتی ہے، یہ الوہی وقت ہے جو انسان کے اندر فطری طور پر رکھ دی گئی ہے۔ اس فلسفیانہ نقطے کو بڑی مہارت کے ساتھ ڈاکٹر صبا جاوید نے داخلی جذباتیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ڈاکٹر صبا جاوید لکھتی ہے:

اور میں اس کے

اس پار

نئی روشنیاں

نئے منظروں کو دیکھتی ہوں

اور حیرتوں میں ڈوبنے سی لگتی ہوں

اور بھولنے لگتی ہوں

کہ ابھی تعلق میرا

زندان، حیات سے بھی قائم ہے(۹)

یہ اسلوبِ بیان پروفیسر صبا جاوید کی پہچان ہے۔ وہ اپنے قطعات میں سہلِ ممتنع کے انداز میں بات کو بیان کرتی چلی جاتی ہیں۔ حالات وواقعات کے تانے بانے اس طرح بنتی ہیں گویا کوئی قصہ گو نہایت دلچسپ کہانی بیان کرتا جارہا ہے اور ہم اس میں اور زیادہ اس میں منہمک ہوتے جاتے ہیں۔ کرداروں کا تذکرہ اور ان کی کردار نگاری اس طرح کی گئی کہ کوئی ابہام باقی نہیں رہتا اور نہ ہی کسی قسم کی نامانوسیت کا احساس ہوتا ہے۔ اس کیوجہ یہ بھی ہے کہ پروفیسر صبا جاوید نے اپنی نظموں میں انتہائی سادہ زبان استعمال کی ہے۔ پروفیسر صبا جاوید کا اسلوبِ بیان بیانیہ قبیل کا ہے اور تہہ دار معنویت کا حامل بھی ہے، علامت اور استعارہ بھی اور کہیں کہیں تجرید بھی۔ ان کی تکنیک سماج کے عصری شعور کے باطن سے ابھرتی ہے اور ان کا اسلوب اسے وہ روپ دیتا ہے جس سے پروفیسر صبا جاوید کی نظمیں اور غزلیں پہچانی جاتی ہیں۔ پروفیسر صبا جاوید کے ہاں آشفتہ بیانی اور شگفتہ اندازِ تحریر قطعات میں رنگ بھرتا ہے اور اس سے ایک منفرد اسلوبِ بیاب سامنے آتا ہے۔ اس اسلوبِ بیان ہی کی یہ خوبی ہے کہ قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ ایک ہی اندازِ سخن زیادہ تر بوریت کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے کہیں پر اسلوبِ بیان عامیانہ تو کہیں پر عالمانہ اور کہیں پر شگفتہ تو کہیں پر سنجیدہ ہونا لازم ہوتا ہے۔ اسلوبِ بیان کے اس ظاہر

ی تبدل کے باوجود شاعر کے اسلوبِ بیان کا جو مجموعی جوہر ہوتا ہے، وہ نہیں ضائع ہونا چاہیے اور ہر دشوار گزار موضوع کو بیان کرنے اور ہر واقعے کو قلم بند کرنے میں اس کا برقرار رہنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی ایک کامیاب شاعر کی نشانی ہے کہ وہ وقت اور موقعہ دیکھ کر اپنا پینترا بدل کر بیانیے میں تبدیلی لاتا ہے جو امر حال کے مقتضیات کو پورا کرتی ہے۔ پروفیسر صبا جاوید نے اس امر کا بدرجہ اتم خیال رکھا ہے اور اسلوبِ بیان کے کئی رنگ دکھائے ہیں۔ اس کا انداز خالصتاً شاعرانہ ہے۔ جس طرح ایک کہانی کار اپنی کہانی کا آغاز دلچسپ اور سنسنی خیز انداز میں کرتا ہے۔ پروفیسر صبا جاوید نے بالکل اسی طرح کا اندازِ بیان اپنی نظموں میں روا رکھا ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان فنی نقطہ نظر سے اپنی جگہ بہت پختہ سہی لیکن یہاں یہ امر قابلِ توجہ رہے کہ اسلوبِ بیان کی شگفتگی اور عامیانے پن میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ایک اچھا شاعر اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے ایسا کر پاتا ہے جبکہ اسلوبِ بیان اگر خاص ہو تو وہ موضوعات کی نوعیت کے ساتھ مخصوص رہتا ہے۔

"صندل کی آگ" میں جو غزلیں کہی گئی ہیں ان کی ردیفیں بھی بڑی انفرادیت کی حامل ہیں۔ غزل کے مزاج کے مطابق وہ ردیفیں استعمال کرنے میں بہت ماہر ہیں۔ غزل میں ردیف اور قافیہ بنیادی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ردیف سے زیادہ قوافی کی اہمیت ہے، حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری میں شعر کے حسن و قبح کے بیان میں جس چیز کا خصوصیت کے ساتھ تذکار کیا ہے وہ اس میں سے قافیہ ایک ہے۔ حالیؔ کے مطابق قافیہ خیال اور بحر کو اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ اور مضمون یا خیال پر اثر انداز ہوتا ہے۔ قافیے کا انتخاب اہم موڑ ہوتا ہے۔ بعض قوافی غزل کی معنیاتی وسعت کو محدود کر دیتے ہیں اور بعض قوافی سہولت بھی پیدا کرتے ہیں۔ قافیے میں بلا کی طاقت ہوتی ہے اور اس کا سامع کی سماعتوں پر اچھا خاصا اثر پڑتا ہے۔ ایک اچھا قافیہ شعر کی جمالیات میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور نامناسب قافیے سے شعر کی جمالیات مجروح ہوتی ہیں۔ قافیے میں نُدرت اس وقت آتی ہے جب شاعر پہلے سے سوچ کر قوافی نہ رکھ لے اور اسے عمداً استعمال میں لائے۔ قافیے سوچ کر غزل کہنے میں جو قباحت ہے وہ سبھی جانتے ہیں کہ اس سے غزل قافیہ بندی کا شکار ہو جاتی ہے۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ محض قافیہ بندی سے شاعری نہیں ہو جاتی اور نہ ہی اس میں شاعرانہ چاشنی آتی ہے۔

رجحان عصری و سماجی شعور کی ذاتی پیشکش ہے۔ "صندل کی آگ" میں غزل کے یہ دونوں طرح کے مضامین شامل ہیں۔ آشوبِ زمانہ اور گردشِ ایام کی تلخی کے نمائندہ ایسے ہی موضوعات کے حامل پروفیسر صبا جاوید کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تیرے خواب بنتے بنتے یونہی آنکھ سی لگی تھی
یہ حقیقتوں کا سورج مجھے کیوں جگا گیا پھر (۱۰)

غزل میں تغزل نہ قافیہ بندی سے آتا ہے نہ ردیف کے بہتر انتخاب یا صنائع بدائع کے استعمال سے بلکہ یہ تو جذبے کی شدت اور صداقت کا محتاج ہے۔ جذبے کی شدت یا وفورِ جذبات سے قافیے کا موزوں انتخاب خود بخود ہو جاتا ہے اور قافیہ غزل کے مجموعی مزاج پر منفی اثرات مرتب نہیں کرتا۔ اردو ادب میں ایسے شعرا کی کمی نہیں ہے جن کی شاعری محض قافیہ بندی اور عروضی تجربات پر کھڑی ہے اور اس میں شعریت عنقا ہے لہٰذا وہ عوام و خواص کی توجہ کو کھینچنے میں ناکام رہی ہے اور آج ان میں سے بیشتر شعرا کے ہم نام بھی نہیں جانتے۔ عصر حاضر کا شاعر قافیے کے بجائے خیال کی تازگی اور فکری سہولت پر زیادہ زور دے رہا ہے کیونکہ یہی اس دور کا چلن اور مقتضا ہے۔ مرصع اور مشکل و ثقیل قسم کے قوافی یا الفاظ و تراکیب کا اب دور نہیں رہا کیونکہ آج کا سامع سہل پسند اور آج کا شاعر آسان گو ہے۔ لہٰذا عصری شعور کو لے کر چلتے ہوئے شعرا ہی قبولِ عام کی سند حاصل کرتے ہیں۔ پروفیسر صبا جاوید اپنی غزلوں میں منفرد قسم کے قافیے کا اہتمام کرتی ہیں۔ ان کے قوافی نہایت خشوع و خضوع کے حامل ہوتے ہیں۔ قوافی اور ردیف کے نفسیاتی برتاؤ کو خوب سمجھتی ہیں۔ اس لیے ان کے ہاں اچھوتے قوافی اور ردیف ملتی ہے جو ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ایسی بات بھی نہیں ہے کہ پروفیسر صبا جاوید کا "صندل کی آگ" مجموعی طور پر قافیے بندی کا نمونہ ہے۔ ان کے ہاں قافیہ غزل کی طرح شعر یا نظم میں بیان کیے گئے موضوع و خیال کے مزاج کے مطابق منتخب ہو کر برتا جاتا ہے۔ "صندل کی آگ" میں بعض نئے قوافی بھی استعمال میں لائے گئے ہیں یا کم از کم ایسے قوافی موجود ہیں جن کو بہر طور بہت کم آزمایا گیا ہے۔ ان میں شاعر نے اپنا انفرادی اور اجتہادی رنگ شامل کیا ہے۔ شعر کی زمین کا انتخاب اور پھر اس کے مطابق قافیے کا انتخاب اور پھر اگلا مرحلہ اس کا شاعرانہ استعمال ہی اس کی صحیح حیثیت کا تعین کرتا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب شاعر روایت اور جدت دونوں کے سنگم پر کھڑا ہو کر اپنی شاعری کو پرکھ رہا ہو اور اس میں قدامت و جدت کے رجحانات کا باریک بینی کے ساتھ مشاہدہ کر رہا ہو۔

پروفیسر صبا جاوید کے بہت سے ایسے اشعار ہیں جن میں دو حرفی قافیہ ہے۔ دو حرفی قافیہ جس شعر میں استعمال ہو اس میں کوئی بڑا شعر نکالنا جو معنیات اور جمالیات سے پُر ہو، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ لیکن "صندل کی آگ" کو پڑھ کر مایوسی نہیں ہوتی بلکہ ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہوتا ہے کہ اچھے اشعار جو غزل کا رنگ و آہنگ اور مضمون لیے ہوئے ہوتے ہیں پروفیسر صبا جاوید کے فی البدیہہ کلام میں بکثرت موجود ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ پروفیسر صبا جاوید: "صندل کی آگ" جاوید پبلشرز، پشاور، ۱۹۹۴ء، ص ۴۹

۲۔ ایضاً، ص ۴۸

۳۔ ایضاً، ص ۵

۴۔ ایضاً، ص ۱۹

۵۔ ایضاً، ص ۸۸

۶۔ ایضاً، ص ۷۶

۷۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۸۔ ایضاً، ص ۷۴

۹۔ ایضاً، ص ۷۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۴۰

References:

1. Professor Saba Javed, *Sandal Ki Aag*, Javed Publishers, Peshawar, 1994, p. 49.
2. Ibid., p. 48.
3. Ibid., p. 5.
4. Ibid., p. 19.
5. Ibid., p. 88.
6. Ibid., p. 76.
7. Ibid., p. 102.
8. Ibid., p. 74.
9. Ibid., p. 75.
10. Ibid., p. 140.